جناب مولانا عبدالحمید رحمانی

بھائی احسان کی یاد میں

[illegible] تک جب میں اپنے احباب کے ساتھ جامعہ رحمانیہ بنارس کی طرف سے جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں پہونچا تو اس وقت احسان بھائی کی گھن گرج سے جامعہ گونج رہی تھی، کچھ ہی دن قبل قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند مدینہ تشریف لے گئے تھے اور دارالعلوم دیوبند جیسے ہندوستان کے عظیم تعلیمی ادارہ کے مہتمم ہونے کی حیثیت سے ان کا محاضرہ جامعہ اسلامیہ میں ہوا جس میں خلاف واقع یہ تاثر دیا گیا کہ یہ ادارہ بجائے اسلام کی حقیقی تعبیر اور حنفیت کی دیوبندی تعبیر (جس میں توسل بالاموات، حیات انبیاء، وحدت الوجود اور وحدۃ الشہود سے لے کر تصوف اور مشائخ پرستی نیز تقلید جامد کے سارے جراثیم بدرجۂ اتم موجود ہیں) کا مرکز ہونے کے سارے مسلمانوں کا تعلیمی مرکز ہے۔ ہمارے دیوبندی بھائی خواہ تبلیغی جماعت کی طرف منسوب ہوں یا جماعت اسلامی کی جانب، دارالعلوم ندوۃ العلماء کی طرف منسوب ہوں یا دارالعلوم دیوبند مظاہر علوم سہارنپور کی جانب، ان کا عجیب وغریب انداز ہے۔ برصغیر میں تو یہ اہل حدیث کو خواہ وہ طالب علم ہو یا عالم ہو، یا عام مسلمان ہو، کسی قیمت پر برداشت کرنے کے تیار نہیں ہوتے، ان کے پیچھے جلدی نماز پڑھنا گوارا نہیں کرتے انہیں غیر مقلد، حشوی، مجسم اور رافضہ کے چھوٹے بھائی تک کے خطاب سے نوازتے ہیں اور اپنے مدارس میں اہل فکر کے حامل طلبہ اور اساتذہ کو کم از کم دوسرے درجہ کا قرار دیتے ہیں، عام سوسائٹی میں ان کے ساتھ اچھوت کا سا سلوک کرتے ہیں۔ لیکن برصغیر سے باہر یعنی سعودیہ وغیرہ میں اسی سلفی فکر کی حامل ان شخصیات کے سامنے اپنے منصب ومرتبہ اور مال وثروت میں اونچا مقام رکھنے ان کا انداز بالکل بدل جاتا ہے، وہاں یہ اہل حدیث کے یا تو مدح وستائش کا اسلوب اختیار کرتے ہیں ورنہ کم از کم معذرت اور ہمدردی کا۔ ٹھیک یہی صورت ان لوگوں کی تصنیفات کی بھی ہے، عربی کی تصنیفات میں عموماً اور بالخصوص اس دور میں یہ حضرات اپنے آپ کو اہلحدیثیت، وہابیت اور کتاب وسنت کا وفادار قرار دیتے ہیں اور اردو کی تصنیفات میں امام ابن حزم، شیخ الاسلام ابن تیمیہ، محمد بن عبدالوہاب، صدیق حسن، نذیر حسین اور سلفیت ووہابیت کے خلاف ان میں سے بعض کی پالیسی نظر انداز کردینے کی ہے اور بعض کی کھلی عداوت ومخالفت کی۔

دارالعلوم دیوبند سے ۱۹۵۳ء میں اہل حدیث طلبہ کو صرف اہل حدیث ہونے کے جرم میں جس بے دردی کیساتھ نکالا گیا اور ان کی تعلیمی زندگی برباد کی گئی اور اس المناک حادثہ پر برصغیر کی اہل حدیث شخصیات اور جماعت ہی نہیں پورا مسلم پریس چیخ پڑا، رئیس احمد جعفری ندوی (جو مشہور متعصب حنفی عالم مولانا حیدر حسن ٹونکی کے شاگرد تھے) بھی اس ظلم کو برداشت نہ کرسکے اور انہوں نے ماہنامہ ریاض کراچی میں ایک مضمون "کیں رہ کہ تو می روی بہ ترکستان است" کے عنوان سے لکھ کر ارباب دیوبند سے یہ سوال کیا تھا کہ جب ایک اہلحدیث عالم ابوالکلام بحیثیت وزیر تعلیم دیوبند گیا تو آپ حضرات نے اس کی توقیر کی انتہا کردی اور جب اہلحدیث فکر کے حامل کمزور طلبہ آپ کے یہاں گئے تو آپ نے ان پر ظلم کی انتہا کردی۔

یہ سارے حقائق احسان بھائی کے سامنے تھے، قاری طیب صاحبؒ کا محاضرہ جب جامعہ اسلامیہ میں ہوا تو وقفہ سوالات میں اس جیالے اور باغیرت سلفی نوجوان نے دوسرے اہلحدیث طلبہ کے تعاون سے مکمل جرأت کے ساتھ قاری طیبؒ سے یہ سوال کر ڈالا کہ اگر یہ سارے مسلمانوں کی درسگاہ ہے تو اس سے اہلحدیث طلبہ صرف اہلحدیثیت کے جرم میں کیوں نکالے گئے؟۔

اس بروقت سوال نے قاری صاحب مرحوم کو عاجز کر دیا کہ سارے غیر اہلحدیث طلبہ نے ان کی مدد کرنے کی کوشش کی مگر ان مدلل حوالوں کے سامنے ان کی ایک بھی نہ چل سکی۔

میں جس وقت جامعہ اسلامیہ میں پہونچا یہ واقعہ نیا نیا ہوا تھا، اس کی گونج جامعہ میں تھی اور حافظ احسان الٰہی ظہیر کا کالج کا یہ آخری سال تھا اور میرا پہلا، ابھی میں وہاں کے نشیب وفراز اور حالات وواقعات سے بالکل واقف نہ تھا، عربی بھی بولنا مجھے نہیں آتی تھی اور دیہاتی ہونے کی وجہ سے صحیح اردو بھی، اور احسان بھائی پاکستان کے عوام اور اخباری دنیا سے علامہ کا خطاب لے کر وہاں پہنچے تھے، ان کے تعلقات پاکستان کی چوٹی کی شخصیتوں سے تھے، وہ ایک باثروت وباغیرت اہلحدیث علم دوست خاندان کے تھے اور ان کا گھر اکابر علماء اہل حدیث سے آباد رہتا تھا، خاص طور پر قدیم وجدید کے جامع عالم ومجتہد علامہ محمد ابراہیم میر سیالکوٹی رحمۃ اللہ علیہ، جو کہ سیالکوٹ کے تھے جہاں کا احسان صاحب کا خاندان تھا، سے تو ان کے

خاندان کے تقریباً ذاتی مراسم تھے۔ مزید برآں حافظ احسان برصغیر ہند و پاک کی عظیم شخصیت اور اپنے دور کے عظیم محدث (جامع معقول و منقول استاذی العلامہ مولانا نذیر احمد رحمانی رحمۃ اللہ علیہ، محدث عصر علامہ عبیداللہ رحمانی مبارک پوری، علامہ عطاء اللہ حنیف بھوجیانی حفظہم اللہ کے استاذ) امام العصر علامہ حافظ محمد گوندلوی رحمۃ اللہ علیہ کے داماد بھی تھے اور شاگرد بھی۔

ہمارے اور ان کے درمیان اس طویل فاصلے کے باوجود ہم دونوں میں ایک چیز قدر مشترک تھی اور وہ تھی مسلک اور تحریک اہل حدیث سے گہرا تعلق، توحید و سنت کے لیے بے پایاں غیرت اور برصغیر میں جماعت اہلحدیث کی عظیم الشان خدمات سے واقفیت اور اس کے تجدیدی و اصلاحی کارناموں پر افتخار و اعتزاز۔

اس وحدت فکر نے ہم دونوں کے درمیان سے سارے پردے ہٹا دیئے۔ ہمارے درمیان ان چند مہینوں کے اثنا میں جن میں ہم دونوں مدینہ میں مقیم تھے بہت سے مسائل ایسے آئے جن میں ہمارا ایک دوسرے سے اختلاف تھا۔ ان کا خاندان تقسیم ملک اور پاکستان کا حامی تھا اور نظریہ پاکستان کے سلسلہ میں علامہ میر سیالکوٹی اور مجاہد عظیم مولانا فضل الٰہی وزیر آبادی سے متاثر جس کے اثرات ان پر پورے طور پر تھے اور میں پوری ایمانداری کے ساتھ اس نقطۂ نظر کا حامل تھا اور ہوں کہ ملک کی تقسیم سے نہ صرف برصغیر کے مسلمانوں کو شدید نقصان پہنچا ہے بلکہ ملک تقسیم نہ ہوتا تو مسلمانان برصغیر اپنے فکر و فہم اور اپنی صلاحیتوں اور جغرافیائی اہمیت کی وجہ سے شرق اقصیٰ اور شرق اوسط کے مسلمانوں کے ساتھ ایک

ایسی اکائی بن سکتے تھے جنہیں روس اور امریکہ کی طاقتیں آنکھ نہ دکھا سکتیں۔ اور [illegible] کی دوسری اقوام کے تعاون سے ان کا بین الاقوامی وزن کہیں بڑھ جاتا۔

اسی طرح ہم دونوں کے درمیان یہ بات تو قدر مشترک تھی کہ برصغیر کے ماضی کے عظیم سلفی ائمہ و مجددین اور علماء و مصنفین کے ہم دونوں عقیدت مند تھے، اسی طرح اس وقت تک کی زندہ شخصیتوں میں بطل جلیل، مجدد سلفیت شیخ الحدیث مولانا محمد اسماعیل سلفی گوجرانوالہ اور مولانا حافظ گوندلوی رحمۃ اللہ علیہم سے ہم لوگوں کو یکساں عقیدت تھی، لیکن ان دونوں عظیم علماء کے علاوہ بقید حیات رہنے والے وہ اکابر جو ہمارے اساتذہ کی صف میں تھے اور ہیں، میں ان کا احترام و اکرام اپنے اساتذہ ہی کی طرح کرتا تھا اور کرتا ہوں جب کہ احسان بھائی کا انداز زندہ شخصیتوں کے بارے میں مجھ سے بہر حال مختلف تھا، وہ طوفان تھے اور میں ایک خاموش طالب علم، ان ساری باتوں کے باوجود جامعہ اسلامیہ میں ہم دونوں ایک دوسرے سے سب سے زیادہ

قریب تھے اور جامعہ میں موجود پاکستانی اہلحدیث و غیر اہلحدیث طلبہ جنہیں ان سے کسی معنی میں دلچسپی تھی، وہ بھی اس تعلق پر رشک کرتے بھی رہتے تھے، لیکن مسلک و عقیدہ کے لیے غیرت اور اپنی تاریخ پر افتخار و اعتزاز اور شیخ الاسلام علامہ ابو الوفا ثناء اللہ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ سے بے پناہ عقیدت ایسی مشترک اقدار تھیں جنہوں نے ہمیں چند ہی مہینوں کی مدت میں ایک دوسرے سے اتنا قریب کر دیا کہ جب امتحان کا زمانہ آیا جو ان کا ڈگری کا امتحان تھا اور وہ پورے سال اپنی مشہور کتاب "القادیانیۃ دراسات وتحلیل" کی تصنیف و ترتیب و تبویب میں مصروف رہنے کی وجہ سے پڑھائی میں پوری محنت نہیں کر سکتے تھے تو میں شب و روز ان کو درس بھی کرتا تھا اور ان کے لیے دعائیں بھی کرتا تھا اور انہیں امتحان کی تیاری پر آمادہ بھی کرتا تھا اور ہمارے اور ان کے درمیان بے تکلف تخاطب کا جو انداز تھا [illegible] استعمال کرتے ہوئے میں کہتا تھا کہ [illegible] اگر تم فیل ہو گئے تو تمہاری خیر نہیں ہوگی۔

میں ان کے ممتاز آنے کے لیے جو اصرار کر رہا تھا اس کا ایک پس منظر تھا، کچھ ہی دن پہلے ایک پٹھان طالب علم حسن جان نام کے، جو اپنی تقلیدی عصبیت میں اس قدر آگے بڑھے ہوئے تھے کہ جامعہ اسلامیہ کا سلفی اور دینی ماحول بھی انہیں نرم نہ کر سکا بلکہ ان کے حنفی تعصب میں مزید شدت آگئی، وہ آخری سال میں ممتاز ڈویژن سے پاس ہو چکے تھے اور اپنی اور دوسروں کی نظر میں احسان پر تھیں کہ فائنل امتحان میں وہ سب سے نمایاں طالب علم "علامہ احسان" کا انجام کیا ہے۔ اور اغیار تو چاہتے ہی تھے کہ وہ ناکام رہیں، کچھ اپنے اس بھول میں مبتلا تھے، آخر ہماری دعائیں اللہ کی توفیق سے قبول ہوئیں، احسان ممتاز آئے، اس موقع پر ان کی کامیابی مبارکباد کے سلسلہ میں میں نے ایک مضمون لکھا جو الاعتصام میں شائع ہوا۔ کسی دوست کے سلسلہ میں میرا یہ پہلا مضمون تھا جو اس کی زندگی میں لکھا گیا ہو۔

جس پس منظر میں میں نے یہ مضمون لکھا تھا معلوم ایک ایک لفظ اس کا غماز تھا اس کا مقصد صرف احسان بھائی کے مورال (MORAL) کو بلند کرنا تھا اور یہ بتانا تھا کہ وہ اقلیت میں ہونے کے باوجود جماعت اہل حدیث علمی میں بہت بڑے رکھتی ہے۔ مگر اس مضمون سے کچھ بزرگوں کو تکلیف پہنچی اور فراغت کے بعد جب احسان پاکستان اور جماعت اہل حدیث پاکستان کی داخلی سیاست میں دلچسپی لینا شروع کی (اور اس سلسلہ میں میرے نقطہ سے بھی ان سے غلطیاں ہوئیں۔ اللہ ہم سب کو معاف کرے) میرے اس مضمون سے بعض بزرگوں نے یہ اثر لیا کہ میں

جماعتی مؤقف کو بھی مکمل طور پر صحیح سمجھتا ہوں۔ میں نے زندگی کا اب تک کا سب سے بڑا تفصیلی خط انہیں ایک 2 کو لکھنا پڑا جس میں میں نے اپنے معتقدات کا پس منظر بتایا۔ بات لمبی ہو گئی، بتانا تھی اپنے اور ان کے تعلق کی بات ــــــ مدینہ میں چونکہ وہ بچوں کے ساتھ مقیم تھے اس لیے انھوں نے مجھے اپنا ہم نوالہ و ہم پیالہ بننے پر مجبور کیا اور مدینہ سے پاکستان واپس ہوتے ہوئے انھوں نے سالی امانت اور سلسلے کاغذات میرے پاس امانت رکھے جو بعد میں ان کی ہدایت کے مطابق پاکستان بھیجے۔

قیام مدینہ کے ان چند مہینوں کی رفاقت کے میں بارہا ہمارے درمیان انفرادی گفتگوئیں بھی رہیں مجلسوں میں بھی ہم شریک ہوئے، ایک آدھ مرتبہ وہ بڑے مشاعرے بھی ہوئے جن میں آپس میں پاکستانی، اور ہندوستانی مسلمانوں کے عنوان سے دلچسپ چھیڑ خانیاں بھی رہیں، انھیں اپنے ملک پاکستان سے غایت درجہ کی محبت تھی اور پاکستان کے بانیوں مسٹر جناح اور لیاقت علی خاں وغیرہ کا ان کے عقائد کی خرابی کے باوجود شدید احترام کرتے تھے اور میں عقائد کو نظر انداز کر کے کسی کے احترام کا قائل نہیں تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ کی علمیت، امامت، سلفیت اور خدمات کا میں بہت قائل تھا اور وہ سیاسی اختلاف کی بنا پر ان پر چھینٹیں بھی کستے تھے اور میں اسے برداشت نہیں کر پاتا تھا کبھی کبھی بات تلخیوں تک جا پہنچتی تھی۔ میں تقسیم ملک کو ملتِ اسلامیہ ہند کے لیے بہت بڑا حادثہ سمجھتا تھا اور وہ اسے ملت کی سب سے بڑی کامیابی سمجھتے تھے۔ ہمارے درمیان

ع "چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد"

تحریک و مسلک اہل حدیث سے عقیدت اور اس کی تاریخ پر محترم شیخ الاسلام علامہ ابوالوفاء ثناء اللہ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ سے بے پایاں عقیدت ہمیں ایک دوسرے سے دور نہیں ہونے دیتی تھی۔

قیام مدینہ ہی کے دور میں انھوں نے اپنے پرانے دوست اور اپنے دور میں جماعت اسلامی کی نفس ناطقہ اور مولانا مودودیؒ کے دست راست اور بعد میں ہونے والے بھٹو کابینہ کے وزیر مولانا کوثر نیازی سے میری ملاقات کرائی، گھنٹوں رفاقت رہی، تفصیلی باتیں ہوئیں اور میں نے دیکھا کہ کوثر نیازی صاحب اس نوجوان طالب علم سے بے انتہا مرعوب ہیں۔

جامعہ اسلامیہ سے ان کی فراغت کے بعد میں تین سال وہاں رہا، ان کے چند خطوط آئے لیکن مراسلات کی بابت اپنی ناقابل معافی سستی اور کاہلی کے باعث میں ان کے کسی بھی خط کا جواب نہ دے سکا۔ احباب کے ذریعہ وہ میری خیریت معلوم کرتے رہے اور میں ان کی۔

مولانا سید محمد داؤد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد پروفیسر ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ اور آگے ہو گئے جماعت مولانا محمد اسماعیل سلفی گوجرانوالہ رحمۃ اللہ علیہ کے درمیان ذہنی دوری بالخصوص پروفیسر ابوبکر غزنوی رحمہ اللہ کے اپنے سلفی خاندان سے نکل کر جہلم کے ایک صوفی سے تعلق کی وجہ سے پروفیسر ابوبکر غزنوی ناظم بننے کے باوجود وہ تعاون نہ دے سکے جس کی توقع مولانا محمد اسماعیل سلفی گوجرانوالہ رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے رفیق کار مولانا داؤد غزنوی رحمہ کے اس باصلاحیت خلف سے تھی۔ نتیجۃً جماعت میں ایک ناہمواری سی پیدا ہوئی، علامہ محمد اسماعیل سلفی رحمۃ اللہ علیہ مجبور ہوئے کہ مالی مشکلات پر قابو پانے اور جماعت کا شیرازہ منتشر ہونے سے بچانے کے لیے ایک متدین اور باغیرت اہلحدیث تاجر کو ناظم بنائیں۔

برصغیر ہند و پاک میں تعلیمی اور دعوتی نیز دیگر علمی مراکز کی قیادت کے سلسلہ میں غیر عالم نیز تاجر حضرات کا جو تجربہ رہا ہے وہ تلخ بھی ہے اور ناکام بھی۔

ایک اور حادثہ ہوا، وہ یہ کہ شیخ الاسلام علامہ ثناء اللہ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ کے معتمد اور مرکزی جمعیت اہل حدیث پاکستان کے اساطین عمر میں سے ایک تجربہ کار شخص حاجی محمد اسحاق حنیف رحمۃ اللہ علیہ کی غیر فطری موت واقع ہو گئی، مولانا غزنویؒ اور مولانا محمد اسماعیل سلفیؒ کی وفات ہو ہی چکی تھی حاجی اسحاق حنیف رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد تقسیم ملک کے بعد پاکستان میں جمعیت کی تشکیل کرنے والے ذمہ داران میں سے صرف مولانا عطاء اللہ حنیف حفظہ اللہ وعافاہ اور مولانا محمد حنیف ندوی حفظہ اللہ کی شخصیتیں بچیں (وبارک اللہ فی حیاتہما ومتع المسلمین بنفعہما وجہا تہا) علامہ حنیف بھوجیانی حالات سے بددل ہو کر اپنے تحقیقی ذوق کے مطابق المکتبۃ السلفیۃ کو لے کر رہے جسے بعد میں مولانا نے ادارۃ الدعوۃ السلفیہ وقف کی شکل دے دی، (فجزاہ اللہ أحسن الجزاء) گوشۂ عافیت میں بیٹھ گئے، مولانا محمد حنیف ندوی حفظہ اللہ پہلے ہی سے [illegible] سے زیادہ علم وتحقیق اور ادب وانشاء کے رسیا تھے، ادارۂ ثقافت اسلامیہ سے ان کے انتساب نے اس پر کچھ مزید اثرات ڈالے اور وہ جمعیت کے تنظیمی ڈھانچے سے دور ہو کر رہ گئے۔ حافظ احسان رحمہ اللہ جیسا متحرک شخص علامہ سلفی گوجرانوالہ کی زندگی تک تو نباہ کر گیا لیکن ان کی وفات کے بعد نئی قیادت سے ان کا نباہ نہ ہو سکا اور مولانا حافظ محمد صاحب گوندلوی رحمہ اللہ سے معنوی طاقت حاصل کر کے شیخ الحدیث مولانا عبداللہ صاحب حفظہ اللہ وغیرہم کے ساتھ انھوں نے ایک نئی جماعت کی تشکیل کی۔ کچھ لوگ درمیان کی

خلیج کو بڑھاتے رہے اور مخلصین کی ہر ممکن کوشش کے باوجود کوئی معقول مصالحتی فارمولہ عمل میں نہ آسکا۔ اس سلسلہ میں پاکستان سے لے کر سعودی عرب اور کویت اور برطانیہ تک کی جماعتوں نے بھرپور کوشش کی، کہا جا سکے کہنے پر اس گنہگار نے بھی اپنی بساط بھر جدوجہد کی لیکن ماشاءاللہ کان وما لم یشأ لم یکن۔

احسان بھائی نے پاکستان جانے کے بعد پنجاب یونیورسٹی سے کئی مضامین میں ایم اے بھی کیا، وہ ماہنامہ ترجمان الحدیث بھی ایڈیٹ کرتے رہے، ذاتی زندگی میں بھی انھوں نے کافی ترقی کی، قلم میں طاقت تھی، زبان میں زور تھا، ذہن رسا تھا، جس ماحول میں وہ پروان چڑھے تھے اس نے انھیں دلیری، بہادری اور شجاعت کی دولت سے نوازا تھا، ان جیسا فعال (DYNAMIC) شخص پاکستان میں ہر لمحہ بدلتے حالات پر خاموش نہیں بیٹھ سکتا تھا، ان کے عزائم بلند تھے، سیاسی زندگی کے لیے جن صلاحیتوں کی ضرورت تھی ان میں وہ بدرجۂ اتم موجود تھیں، چنانچہ انھوں نے ایک طرف اپنے دینی خیالات کی ترویج کے لیے مسجد چینیاں والی کی خطابت کی ذمہ داری سنبھالی، جماعت کے اجتماعات میں توحید وسنت اور دیگر اسلامی موضوعات پر اپنی شعلہ نوائی اور سحر البیانی سے ایک جم غفیر کو متاثر کیا اور اپنے قلم کی روانی سے عربی، اردو وغیرہ زبانوں میں مضامین، مقالات اور بیش بہا تالیفات کا ایک انبار لگا دیا اور دوسری جانب انھوں نے عملی سیاست میں بھی حصہ لیا، مدینہ منورہ سے واپسی کے بعد ۱۹۶۸ء سے انھوں نے باقاعدہ سیاسی زندگی شروع کی بھٹو کی حکومت میں انھیں جیل بھی جانا پڑا اور اصغر خان کے حزب استقلال کے وہ اطلاعات کے سکریٹری بھی رہے اور ۱۹۷۷ء میں حزب استقلال کے قائم مقام صدر بھی رہے۔ اخیر میں انھوں نے اہلحدیث یوتھ فورس قائم کیا، اسی اہلحدیث یوتھ فورس کا اجلاس ہو رہا تھا جس میں یہ حادثہ پیش آیا۔ ان کی شعلہ نوائی اور پرتند خطابات اور جذبات میں ہلچل مچا دینے والی تحریروں نے انھیں اگر ایک طرف سیاست کے میدان میں کامیابی سے قریب تر کیا تو دوسری جانب ان کے حاسدوں کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ ان کی بے جگری، صراحت اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گفتگو کے انداز نے سلفی تنظیموں اور ان کے قائدین کو اس قدر مرعوب کر رکھا تھا کہ کوئی تنظیم اور کسی بھی جماعت کا قائد ان کے سامنے آنے سے گھبراتا تھا۔

رفض وتشیع اور باطنی فرقوں نیز بریلویت کے خلاف ان کی قلمی اور لسانی جنگ نے ارباب رفض وبدعت کی نیند حرام کر دی تھیں اور ان کے خلاف سازشوں کا ایک جال پھیلا ہوا تھا۔

آخری دور کی سیاسی لڑائی میں وہ جماعت کے ایک بڑے ترجمان بن کر ابھرے تھے جس سے جماعت اہلحدیث کے سارے مخالف گھبراتے تھے۔

ایک انتہائی ثقہ راوی کی روایت کے مطابق حکومت الٰہیہ قائم کرنے کی مدعی مشہور تنظیم کے ذمہ داران سے زندگی کے آخری ایام میں انھوں نے جس جرأت مندانہ انداز میں گفتگو کی اور اس تنظیم کے ذمہ داروں سے ان کی اعتقادی اور فکری غلطیوں، سیاسی بے بصیرتی، جوڑ توڑ اور سازشی ذہنیت کا اعتراف انھوں نے جس طرح دلائل وبراہین کی روشنی میں کرایا یہ انھیں کا حصہ تھا۔ یہ پورا ڈائیلاگ کیسٹ میں محفوظ کر لیا گیا۔ کاش وہ محفوظ ہوتا اور جماعت کے نوجوانوں کو اس سے حوصلہ ملتا، مگر افسوس کہ وہ کیسٹ ایک سازش کے تحت ضائع کر دی گئی۔

خواہ سیاسی گفتگو ہو یا اعتقادی اور فکری، اسٹیج ہو، پلیٹ فارم ہو، نہ صرف جماعت اہلحدیث میں بلکہ میرے علم کی حد تک دوسری جماعتوں میں بھی ان کا کوئی مثیل نہیں تھا۔

۲۸ فروری تا ۱۳ مارچ ۱۹۸۵ء میں جب ڈھاکہ بنگلہ دیش میں جمعیت اہلحدیث بنگلہ دیش کی عالمی کانفرنس منعقد ہوئی اس میں میں بھی مدعو تھا اور پاکستان سے احسان بھائی مدعو تھے۔ دونوں نے وہاں کانفرنس میں اور کانفرنس کے باہر مختلف مقامات پر اپنے اپنے طرز کی تقریریں بھی کیں اور ایک زمانہ کے بعد چند روزہ یکجائی کا موقع بھی ملا، ہم دونوں کا ایک ہی ہوٹل میں قیام تھا، بہت سارے موضوعات زیر بحث آئے، مدینہ منورہ کی یادیں تازہ ہو گئیں۔ اس موقع پر میں نے جمعیت اہلحدیث پاکستان کے سلسلہ میں ان سے تفصیلی گفتگو کی، ہر ممکن طریقے سے انھیں قائل کرنا چاہا کہ چونکہ وہ ایک باشعور عالم دین ہیں، غیرت مند اہلحدیث ہیں، اپنی خدمات، صلاحیتوں اور اپنی مقبولیت کی وجہ سے ان کی حیثیت ایک طاقتور شخصیت کی ہے اس لیے پہل کر کے جمعیت کو انتشار سے بچانے کی تدابیر عمل میں لانی چاہیے۔ لیکن مجھے محسوس ہوا کہ وہ اپنے مخالف فریق سے سخت بیزار ہیں اور انھیں توقع ہے کہ جماعت کی اکثریت ان کا ساتھ دے گی اور وہ قیادت کے لیے اپنا استحقاق ثابت کر سکیں گے اور جماعت کو جمود اور گراوٹ سے بچانے کی راہ میں وہ شدت سے اس بات کو محسوس کرتے ہیں کہ انھیں جماعت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں رکھنی چاہیے۔

اب یہ تو مستقبل کا مورخ ہی فیصلہ کرے گا کہ ان کا یہ فیصلہ کس حد تک صحیح تھا اور مجھے امید ہے کہ اس حادثہ جانکاہ کے بعد جماعت اہلحدیث پاکستان اپنی کمزوریوں کو پورے طور پر محسوس کرے گی اور حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی اپنی صحت کی انتہائی نزاکت کے باوجود نیز مولانا محمد حنیف ندوی

مولانا عبدالخالق رحمانی، مولانا محمد عبدہ، پروفیسر غلام احمد حریری، ابوسلمان شاہجہاں پوری، مولانا عزیز زبیدی، مولانا عبدالغفار حسن، مولانا بدیع الدین شاہ اور دیگر ذمہ داران و مخلصین جماعت آگے بڑھ کر صورت حال کو سنبھالنے کی کوشش کریں گے۔ دعا ہے کہ رب العالمین اسلام کی صادق ترین تعبیر کی حامل اس واحد تحریک کو پھر انتشار و تشتت اور جمود سے محفوظ رکھے آمین۔

رضا شاہ پہلوی کی حماقتوں کے نتیجہ میں خمینی جیسا جذباتی اور نا عاقبت اندیش منفی ذہن کا جنونی ایران میں برسر اقتدار آچکا تھا جس نے ایک طرف ایران کے اہل سنت کا جینا حرام کر رکھا تھا دوسری جانب عراق کی ایک مزعومہ غلطی کو بہانہ بنا کر وہ پورے جزیرۃ عربیہ پر تسلط کی سازشیں امریکہ، اسرائیل اور دوسری اسلام دشمن طاقتوں سے کر کے اس ابدی شکست کا بدلہ اسلام اور مسلمانوں سے لینا چاہتا تھا جو قرن اول میں اسلامی اور عملی عقیدۂ توحید کے نتیجہ میں اسلام کو فارس کے آتشکدہ پر حاصل ہوئی تھی اور اسلام نے ہمیشہ ہمیش کے لیے فارس کے مجمر کو ٹھنڈا کر کے رکھ دیا تھا اور آتش پرستی کی لعنت دنیا سے ختم کر دی تھی۔ خمینی کی پلاننگ تھی کہ وہ حرمین پر قبضہ کرے اور حضرت فاطمۃ الزہراء کی قبر کو نیا کعبہ بنائے۔

حافظ احسان نے بہت شدت کے ساتھ اس سازش کو محسوس کیا، انھوں نے اس سلسلہ میں سعودی عرب، عراق نیز دیگر عرب حکومتوں کے ذمہ داران سے گفتگو کی، انھیں صورت حال کی نزاکت بھی سمجھائی اور جس انداز کی سازشیں ایران اور اس کے ہمنوا کر رہے تھے اور برصغیر نیز انڈونیشیا و ملیشیا وغیرہ میں احیائے اسلام کی دعوے دار تنظیمیں جس طرح اپنی پوری صلاحیتوں کو شعوری یا غیر شعوری طور پر خمینی کے پروپیگنڈوں کی نشر و اشاعت کے لیے وقف کر چکی تھیں ان سے بھی انھوں نے پردہ اٹھایا اور رفض و تشیع، باطنیت و اسماعیلیت اور باطنی تحریکوں کے ساتھ ساز باز کرنے والی اہل سنت کی طرف منسوب "بریلویت" کا پردہ اپنی تحقیقی کتابوں کے ذریعہ انھوں نے چاک کیا۔

احسان بھائی کو ایک خاص صلاحیت جو قدرت نے ودیعت کی تھی اور جس کی نشو و نما میں ان کے والد ان کے اساتذہ اور ان کے گھر آنے جانے والے علماء کرام کا زبردست ہاتھ تھا اور خاندانی وجاہت نے اس کو جلا بخشی تھی وہ ان کے اندر قوت فیصلہ کی مضبوطی اور فراوانی تھی۔ انھیں اپنے مطالعہ اپنی تحقیق پر اتنا اعتماد تھا کہ جیسے وہ ایک بدیہی اور یقینی حقیقت ہو، خطابت، صحافت، تحقیق و تالیف ہر چیز میں ان کی کامیابی کا راز ان کی یہی جرأت اور فیصلہ کی قوت تھی۔ ان کی پہلی تصنیف "القادیانیۃ دراسات وتحلیل" جس کا پہلا نسخہ غالباً انھوں نے مجھی کو ہدیہ کیا تھا ان کے ان مقالات کا مجموعہ ہے جو انھوں نے "حضارۃ الاسلام" دمشق میں جو ڈاکٹر ادیب صالح کی ادارت میں نکلتا تھا، شائع کرائے تھے۔ اس کتاب کے ہر ہر مقالہ کی ہر ہر سطر ان کی اس خود اعتمادی کا ثبوت ہے۔

بعد میں انھوں نے جو کتابیں لکھیں ان میں "الشیعۃ والسنۃ"، "الشیعۃ واھل البیت"، "الشیعۃ والقرآن"، "الشیعۃ والتشیع"، "الاسماعیلیۃ"، "البریلویۃ"، "البابیۃ"، "البہائیۃ"، "مرزائیت اور اسلام" اور ان کے دیگر مقالات و مضامین میں بھی خاص بات ان کی خود اعتمادی ہی کی ہے۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ ان کی کتابوں میں تحقیق نہیں، عمق نہیں، تحلیل و تجزیہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں ذہانت دی تھی، علم دیا تھا، تحقیقی ذوق دیا تھا، مطالعہ کی وسعت دی تھی، پھر انھیں اپنی ذاتی وجاہت و ثروت کی وجہ سے مراجع مہیا کرنے میں کبھی کوئی دشواری پیش نہیں آئی، فارسی، عربی، اردو اور پنجابی میں مہارت اور انگریزی کی معلومات کی وجہ سے انھیں ان ساری زبانوں سے براہ راست استفادہ کا موقع ملا اور انھوں نے یہ موقع کبھی نہیں کھویا۔

ان کی تقریباً ساری کتابیں اور مقالات اسلام کے خلاف زیر زمین کام کرنے والی باطنی تحریکوں سے متعلق ہیں۔ خوبی یہ ہے کہ ان تخریبی باطنی تحریکوں کے اصل مراجع جو پردہ میں چھپا دیئے گئے تھے ان تک وہ پہنچنے میں کامیاب رہے۔ ان کے مخطوطات کو انھوں نے کھنگالا اور خود انھیں کے آئینہ میں ان کا چہرہ دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔

یہاں میں سلفی نوجوانوں کی توجہ ایک خاص نکتہ کی طرف مبذول کراؤں گا وہ یہ کہ اسلام کی صحیح شکل کو بگاڑنے کے سلسلہ میں زیر زمین تخریبی طاقتوں نے جب سے کام شروع کیا ان سے نبرد آزما ہونے کے لیے خیر القرون کے بعد جو ارباب علم و فہم آگے بڑھے وہ سلفی ہی تھے کیوں کہ اسلام کی صادق ترین تعبیر کے یہی حامل تھے، دور سلف کا احیاء ان کا مطمح نظر تھا۔ منہج سلف ہی کو یہ اسلام کی صحیح ترجمانی سمجھتے تھے اور انھیں کے اندر یہ صلاحیت تھی کہ اسلام کے خلاف اٹھنے والے فتنوں کو بر وقت بھانپ لیں اور ع

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من انداز قدت را می شناسم

کہہ کر اس کا قلع قمع کرنے کے لیے اپنے سر دھڑ کی بازی لگا دیں۔ حجۃ الاسلام مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی نے ایک مرتبہ شیخ الاسلام علامہ ثناء اللہ امرتسری کے بارے میں کہا تھا کہ اگر کوئی فتنہ اسلام کے خلاف صبح کو اٹھنے والا ہو تو شب ہی میں شیخ اپنے نور بصیرت سے اس کا احساس کر لیتے ہیں اور اس کا سر کچل کر

ہی کر دیتا ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ خاکسار تحریک، سُدھی سنگٹھن، قادیانیت اور عبداللہ چکڑالوی وغیرہ کے فتنۂ انکارِ حدیث اور مولانا مودودی رحمہ اللہ کے مسلکِ اعتدال کے ذریعہ پیدا کیے گئے فتنۂ تشکیک فی السنۃ کو مولانا امرتسریؒ نے بروقت بھانپا اور ایک کامیاب جراح کی طرح ان کا کامیاب ترین آپریشن کر کے رکھ دیا۔

ماضی بعید میں خیر القرون کے بعد شیعیت و رفض، اور باطنیت کی دوسری شاخوں کے خلاف امام المحدثین حضرت امام شافعی نے اپنی کتاب "الرسالۃ" میں، امام اہل السنۃ احمد بن حنبل نے اپنی تصنیفات میں، امام بخاریؒ نے الجامع الصحیح تراجم الابواب کے ضمن میں اور اپنی دوسری تصنیفات میں اور امام ابن قتیبہ دینوری اور امام ابن خزیمہ وغیرہ نے اپنے اپنے دور میں امام ابن حزم اندلسی نے اپنی کتاب "الفصل فی الملل والاھواء والنحل" میں اور شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ نے "منہاج السنۃ النبویۃ" میں ابن العربی نے "العواصم من القواصم" میں امام ذہبی نے "المنتقی" میں، شاہ عبدالعزیز نے "مختصر التحفۃ الاثنی عشریۃ" میں، اور شیخ الاسلام علامہ ثناء اللہ امرتسریؒ نے اپنی تالیفات میں اسلام کی اصل شکل کو بگاڑنے کی مجرمانہ سازشوں کا پردہ چاک کر کے رکھ دیا اس راہ میں اپنی ساری صلاحیتیں صرف کر دیں، مرحومین میں اس سلسلہ کی آخری کڑی علامہ محب الدین خطیب رحمہ اللہ کی ہستی تھی قاہرہ جیسے آخری دور کے بڑے اہم اسلامی مرکز میں اپنے ہفت روزہ "الفتح" ماہناموں "الزھراء" "المسوید" اور جامع ازہر کے ترجمان "مجلۃ الازہر" کے ذریعہ باطنی تحریکوں کے خلاف سلف کی جدوجہد اور قربانیوں کے تاریخی تسلسل کو برقرار رکھا اور ملتِ اسلامیہ کی طرف سے تقریباً پچاس سال کی طویل مدت تک صحیح اسلام کے دفاع کا محاذ سنبھالے رکھا اور انہوں نے سلف کی جلائی ہوئی شمع کو تا دم زیست روشن رکھا رفض و تشیع، بہائیت، بابیت اور باطنیت کے سارے کمل کر کے سامنے آ گئے جب رفض و تشیع کے غلبہ کے لئے انہوں جامع ازہر میں دوبارہ خلفائے فاطمیین کے ملحدانہ ادوار دور کا احیاء کرنا چاہا اور "التقریب بین المذاہب الاسلامیۃ" کے نام سے جامعہ ازہر میں اثنا عشری عقیدہ و فقہ کا شعبہ چاہا تو بقول ہمارے استاذ شیخ محمد منتصر فرج جنہیں دشمن حافظ الاسد کے اشارہ پر اس کے کاسہ لیسوں نے دن قتل کر دیا اور ان کے چھوٹے چھوٹے بچوں کو یتیم اور بیوہ بنا دیا رحمہ اللہ وغفر لہ اور باغیرت سلفی اور دیگر علماء اہل سنت حق کو منافقین

خطیب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے عرض کیا کہ خلاف اس وقت اگر دنیائے اسلام میں کوئی شخص جرأت رندانہ کر سکتا ہے تو وہ تنہا آپ ہیں۔ علماء کی اس لبیک کہتے ہوئے محب الدین خطیب نے "الخطوط العریضۃ للاسس التی قام علیہا دین الشیعۃ الاثنی عشریۃ الامامیۃ" نام کا اپنا کامیاب جامع اور مختصر رسالہ لکھا۔

محب الدین مرحوم کی وفات ۱۹۶۹ء میں ہوئی احسان بھائی اس کے دو سال پہلے جامعہ اسلامیہ سے فارغ ہو کر پاکستان لوٹے تھے۔ محب الدین خطیب مرحوم کے بعد جب انہوں نے دیکھا کہ باطنیت پھر کذب، تقیہ، خداع، اور مکر و فریب کی ساری فتنہ سامانیوں کے ساتھ میدان میں آ رہی ہے تو انہوں نے محب الدین خطیب کے جلائے ہوئے چراغ کو اپنے خطیبانہ اسلوب میں بھرپور اعتماد و یقین کے ساتھ مزید روشن کر دیا اور یہ روشنی ان شاء اللہ مستقبل میں کافی دنوں تک سلفی نوجوانوں کو اپنا ورثہ، اپنا ماضی اور اپنا تاریخی تسلسل یاد دلاتی رہے گی۔

مدینہ منورہ کے دور کے بعد احسان بھائی سے دو ایک ملاقاتیں خانہ کعبہ میں ہوئیں۔ ایک مرتبہ منی میں ملاقات ہوئی اور ایک مرتبہ جیسا کہ میں نے اوپر ذکر کیا ہے بنگلہ دیش میں تفصیلی ملاقات ہوئی، لیکن آنے اور جانے والوں کے ذریعہ وہ میری خیریت معلوم کرتے رہے اور میں ان کی۔ حکیم اجمل خاں سابق ناظم جمعیت اہل حدیث ہند اپنے عزیزوں سے ملنے جب پاکستان گئے تو احسان بھائی نے ان سے میری خیریت پوچھی، تفصیلی حالات معلوم کیے، اور میری خاموشی اور میرے جمود و نیز میری سستی دکاہلی پر مجھے ملامت کے پیغام بھیجے، اور میں نے ہمیشہ انہیں مسلک و تحریک و جماعت کے سلسلہ میں اسم باسمہ احترام الاور اور جماعت کی صفوں سے انتشار و تشتت دور کرنے کے لیے بھرپور جدوجہد اور قربانیوں کی گذارش کے پیغامات بھیجے۔

سعودی عرب میں بارہا ان کی شخصیت، ان کی تصنیفات اور دوسری مساعی کے بارے میں ڈاکٹر عبداللہ صالح عبید چانسلر اسلامک یونیورسٹی مدینہ منورہ سے جامعہ اسلامیہ میں اور ان کے مکان بدائع قصیم، میں نیز ڈاکٹر عبداللہ ترکی مدیر جامعۃ الامام محمد بن سعود الاسلامیہ سے، شاہ عبدالعزیز بن عبدالرحمن آل سعود کی سوانح حیات سے متعلق منعقدہ انٹرنیشنل کانفرنس منعقدہ جنوری ۱۹۸۶ء میں جس میں میں مدعو تھا اور خود ڈاکٹر صاحب کے دولت خانہ پر احسان بھائی کا تذکرہ رہا۔ جب شؤون حرمین کے صدر شیخ سلیمان العبید نے شیعیت سے متعلق ان کی تالیفات پر خوش ہو کر انہیں اپنی طرف سے ایک تشیعی اعلام

دیا تو ان کے ساتھ اس مسلکی رشتہ اور پرانے تعلقات کی بنا پر مجھے بے انتہا مسرت ہوئی۔

ایک مرتبہ دنیائے اسلام کے عظیم مصلح اور محبوب ترین بزرگ، عظیم محدث و مفکر، امام علامہ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز رئیس ادارات البحوث العلمیۃ والافتاء والدعوۃ والارشاد کے دولت کدہ پر حاکم راس الخیمہ مدعو تھے۔ شیخ نے جو میرے لیے ایک شفیق باپ کی حیثیت رکھتے ہیں مجھے بھی اس موقع پر اپنے دولت کدہ پر آنے کا حکم دیا۔ چنانچہ جب حاکم راس الخیمہ کے ساتھ تبادلۂ خیال ہونے لگا تو شیخ نے بڑی جرأت اور حق گوئی کے جذبہ کے ساتھ امارات میں پھیل رہی "بریلویت" اور خرافات و بدعات پر حاکم راس الخیمہ کو متنبہ فرمایا اور انہیں اس فتنہ سے بچنے کی نصیحت بلکہ سخت تاکید فرمائی اور احسان بھائی کی کتاب "البریلویۃ" پڑھنے کی تلقین کی اور مجھے مخاطب فرما کر استصواب چاہا تو میں نے البریلویۃ کو وقت کی مفید ترین کتاب کہہ کر اپنی رائے کا اظہار کیا۔

باوجودیکہ بے تکلفی میں میں بہت سی چیزوں کی بابت سینیارٹی کا لحاظ کیے بغیر احسان بھائی کو اشارتاً بھی کہہ دیا کرتا تھا اور جماعت و جمعیت اور علماء جماعت کے سلسلہ میں ہمارا اور ان کا سوچنے کا انداز خاصہ مختلف تھا۔ میں اس کا قائل تھا اور ہوں اور میری جماعتی زندگی کے پچھلے ۲۰ سال اس کے گواہ ہیں کہ بڑوں کی طرف سے کتنا بھی ظلم کیوں نہ ہو، ان کی طرف سے کتنی بھی حوصلہ شکنی کیوں نہ ہو، کبھی بھی چھوٹوں کو اپنی نیاز مندی میں فرق نہیں آنے دینا چاہیے اور جماعتی راہ میں ذاتی حق تلفی گوارا کیے بغیر اور صبر و ایثار کی اعلیٰ مثالیں پیش کیے بغیر نہ تو انسان کامیاب ہو سکتا ہے نہ جماعتیں اور تنظیمیں ترقی کر سکتی ہیں۔

اس سلسلہ میں میں ہمیشہ سیف اللہ خالد بن الولیدؓ اور فاتح ہند محمد بن قاسم رحمہ اللہ کی مثالوں کو سامنے رکھتا ہوں۔ اور احسان بھائی کا نقطۂ نظر تھا کہ "انصر اخاک ظالما أو مظلوما" (کہ ظالم کو اس کے ظلم سے روک کر اس کی مدد کرنی چاہیے) وہ جسے اپنے نقطۂ نظر سے جماعتی معاملات میں ظالم سمجھتے تھے اس کے خلاف نبرد آزما ہو جاتے تھے۔ ہمارے اور ان کے درمیان نقطۂ نظر کے اس اختلاف کے باوجود جب ان کی بابت کوئی تکلیف دہ بات میں سنتا تھا خاص طور پر جب اس سے شماتت اعداء کا خطرہ ہوتا تو مجھے سخت تکلیف ہوتی تھی۔ اسی سلسلے کے دو واقعات میرے لیے سخت اذیت کا باعث بنے۔

ایک واقعہ تو وہ ہے جو چند سال قبل کویت کے احباب و مخلصین بالخصوص وہاں کے سلفیوں کے نوجوان رہنما اور جمعیۃ احیاء التراث الاسلامی کویت کے ذمہ دار طارق العیسیٰ نیز کویت و خلیج میں سلفیت کی حکیمانہ دعوت دینے والے شیخ عبدالرحمن عبدالخالق کے ذریعہ کی جانے والی جماعت اہلحدیث پاکستان کے ذمہ داران کے درمیان مصالحت کی کوشش ناکام ہونے کے بعد وہاں کے اخبارات میں تکلیف دہ خبریں شائع ہوئیں اور جس طرح جماعت کی آبرو کھلے چوراہے نیلام ہونے لگی اور اکابرین جن میں احسان بھائی بھی تھے تحریکی شخصیات کی بابت بے انتہا نامناسب باتیں سامنے آئیں۔ اور دوسری بار مجھے اس وقت بے انتہا تکلیف ہوئی جب ہندوستان سے جماعت اہل حدیث کی عظیم جامعہ کے ایک نمائندہ نے جامعہ ہی کے اردو ماہنامہ میں سطحی اور بھونڈے انداز میں احسان بھائی اور ان کے ساتھ وفات پانے والے مولانا حبیب الرحمن یزدانی کا تمسخر کیا۔ اور احباب جماعت اہل حدیث پاکستان کو اس سے سخت تکلیف ہوئی۔

جب ہماری جامعہ اور ہماری جماعت کی طرف سے شائع ہونے والے اس پرچہ کی شکایت پچھلے رمضان میں قاضی محمد اسلم صاحب سیف فیروزپوری اور دیگر سنجیدہ ذمہ داران جماعت نے مسجد حرام میں بیٹھ کر مجھ سے کی تو جامعہ اور جماعت کا دفاع تو میں نے کیا لیکن میرا سر ندامت سے جھک گیا۔ مگر ان دونوں واقعات میں میں نے احسان بھائی یا ان کے کسی دوست کا ایک لفظ بھی نہیں لکھا، اس لیے کہ ایسے مواقع پر تحریر میں آئی ہوئی چیزیں عموماً صورت حال کو مزید بگاڑ دیتی ہیں۔ میں صرف دل میں کڑھ کے اور اللہ سے صبر کی دعا کر کے رہ گیا۔

احسان بھائی کے سلسلہ میں ہمارے دوست عبدالعزیز بن محمد بن عتیق آل عتیق، جو مجدد عصر شیخ الکل فی الکل میاں نذیر حسین محدث دہلوی رحمہ اللہ کے شاگرد رشید امام سعد بن عتیق کے علمی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور لاہور میں مکتب الدعوۃ کے ڈائریکٹر ہیں، سے برابر تبادلۂ خیال ہوتا رہا ہے، وہ ان کی جرأت، دلیری کے قائل بھی ہیں اور قدردان بھی، ملت کے سلسلہ میں احسان بھائی کی جدوجہد کے بہت سے گوشوں سے انھوں نے پردہ اٹھایا۔ انھیں کے مسلسل اصرار کا نتیجہ حافظ احسان کی کتاب "الاسماعیلیۃ" ہے۔

احسان صاحب کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر فضل الٰہی ظہیر محمد بن سعود اسلامک یونیورسٹی ریاض کے ایک کامیاب پروفیسر جماعت کے ایک باغیرت و بابصیرت اور حکیم و دانا عالم ہیں۔ اپنی خاموش جماعتی خدمات کے ذریعہ انھوں نے اصلاح عقائد اور [illegible] فروغ کے اچھے اور کامیاب تجربے کیے ہیں۔ ان سے جب بھی ریاض یا مکہ مکرمہ میں ملاقات ہوئی تو موضوع سخن احسان بھائی بھی رہے۔ فضل الٰہی صاحب جیسے خاموش، باوقار، سنجیدہ جوان میں نے بہت کم دیکھے ہیں۔

چند ماہ قبل جب میں دہلی سے باہر ہندوستان کے مختلف

علاقوں کے دورہ پر تھا تو گوجرانوالہ کی جماعت کے ایک مشہور خاندان کے ہونہار فرزند محمد زبیر صاحب ایک خاص مسئلہ سے متعلق احسان بھائی کا ایک خط لے کر آئے اور کئی روز تک میرے انتظار میں دہلی پڑے رہے۔ آتے ہی میں ان سے ملا اور احسان بھائی کے حکم کی تعمیل کی۔ اپنے خط میں انھوں نے [illegible]ری کے شروع میں منعقد ہونے والی کیرلا کے ندوۃ المجاہدین کی عالمی کانفرنس کے دعوت نامہ کا تذکرہ کیا تھا اور توقع دلائی تھی کہ غالباً اسی بہانے وہ آکر اپنے چھوٹے بھائی سے دہلی میں مل لیں گے، بارہا انھوں نے مجھے پاکستان بلایا مگر میں نہ جا سکا۔ بنگلہ دیش کی ملاقات میں میں نے ان سے کہا کہ دہلی ہوتے ہوئے پاکستان چلے جانا لیکن انھوں نے مستقبل میں ایک جامع پروگرام کا وعدہ کرکے جان چھڑا لی۔ میں نے سوچا تھا کہ میں مدینہ کی زندگی میں ان کے بچوں کو دیکھ چکا ہوں وہ بھی آئیں اور اپنے بھتیجوں اور بھتیجیوں کو دیکھ لیں۔ مگر کیا خبر تھی کہ تقدیر الٰہی کا فیصلہ کچھ اور ہے۔ میں ریڈیو سنتا نہیں اس لیے ۲۳ کے بجائے ۲۴ مارچ کی صبح کو اخبارات سے بم کے حادثہ کی خبر ملی، حیران و ششدر رہ گیا۔ خبر میں احسان بھائی کے زخمی ہونے اور اسٹیج پر موجود کچھ لوگوں کی وفات کا بھی تذکرہ تھا، بعد میں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب یزدانی اور مولانا عبدالخالق قدوسی وغیرہم رحمہم اللہ کی وفات کی خبر الاعتصام لاہور وغیرہ کے ذریعہ معلوم ہوئیں۔ احسان بھائی کی بابت شروع کی خبروں میں کسی حد تک امید کی کرن موجود تھی، لیکن جب انھیں علاج کے لیے سعودی عرب لے جانے کی خبر معلوم ہوئی تب میری تشویش میں بے انتہا اضافہ ہو گیا اور وہی ہوا جس کا خطرہ تھا۔ علامہ شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز حفظہ اللہ کے دفاتر کے مشرف عام شیخ عبدالعزیز بن ناصر بن باز حفظہ اللہ نے جو ہمارے اور احسان بھائی کے تعلقات سے اچھی طرح واقفیت رکھتے ہیں فون پر اپنی اور علامہ شیخ ابن باز کی طرف سے اس حادثہ جانکاہ کی خبر دی اور تعزیت کرتے ہوئے فرمایا کہ تم تعزیت کے سب سے زیادہ مستحق ہو، دعائیں کی گئیں، لیکن احسان نے جس طرح بہادری اور شجاعت کے ساتھ شہرت و ناموری کی زندگی گزاری تھی اسی طرح اس نے شہرت و ناموری کی موت پائی۔

رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

ہم اس کے علاوہ کیا کر سکتے ہیں کہ رب رحیم سے دعا کریں کہ وہ احسان بھائی اور ان کے ساتھ مرنے والوں کو شہادت کے درجات علیا سے نوازے اور ہم کمزوروں اور بزدلوں کو بھی ہمت دے اور ہمیں بھی شہادت کی موت عطا فرمائے آمین۔

جن دنوں یہ حادثہ پیش آیا ان دنوں رئاسہ عامہ ادارات بحوث علمیہ وافتاء ودعوت وارشاد کے باہری امور کے ڈائرکٹر جنرل شیخ محمد بن قعود حفظہ اللہ ہندوستان میں موجود تھے۔ نہایت دلفگار انداز میں انھوں نے واقعات کی تفصیل معلوم کرنا چاہی لیکن میں کیا خبر دیتا، میں تو خود اس سے زیادہ شدید غم و الم کی کیفیت میں مبتلا تھا جس میں وہ تھے۔

ریاض میں ان کی وفات کے حادثہ پر غم و الم کی جو شدید کیفیت پیدا ہوئی اس کا علم ہمارے ایک عزیز عالم اور محقق دوست اور ابوالکلام آزاد اسلامک اویکننگ سنٹر کے مخلص خیر خواہ شیخ عبدالقدوس محمد ندیم ریسرچ اسکالر مجلس القضاء الاعلیٰ ریاض نے دی اور جنازہ وغیرہ کی تفاصیل بتائیں۔ شیخ عبدالعزیز بن عتیق اور عزیزم عبدالقدوس بن محمد ندیم کے ذریعہ یہ معلوم کرکے تھوڑی سی کوفت البتہ ہوئی کہ احسان بھائی کے والد حفظہ اللہ نے موت کی جگہ ریاض کے بجائے مدینہ میں ان کی تدفین پر اصرار کیا اور بالآخر جنازے کی تدفین مدینہ ہی میں عمل میں آئی۔ کاش وہ اپنے جذبات کی اتنی قربانی دے سکتے کہ سلف کی طرح جہاں وفات ہوئی وہیں تدفین عمل میں آتی۔

احسان بھائی بڑے خوش قسمت تھے کہ ان کی نماز جنازہ موجودہ دور کے موحدین اور متبعین سنت کے امام شیخ عبدالعزیز بن باز نے پڑھائی اور ان کی نماز جنازہ میں شرکت ان علماء اور طلبہ اور اعیان نے کی جو موجودہ دور میں توحید اور اتباع سنت کا رمز اور شرک و بدعات مٹانے کے نشان مانے جاتے ہیں۔ چند ہی دنوں کے بعد گوجرانوالہ کی جماعت اہل حدیث اور مولانا اسماعیل صاحب گوجرانوالہ کے تربیت دادہ اخوان جماعت کا ایک وفد آیا، ان سے لاہور کے اس دلدوز حادثہ کی تفصیلات معلوم ہوئیں۔ اسی اثنا میں ہمارے دوست شیخ عبدالعزیز بن محمد بن عتیق آئے، تقریباً تین دن تک سفر و حضر میں ہماری اور ان کی گفتگو کا موضوع احسان بھائی اور جماعت و جمعیت اہل حدیث پاکستان ہی رہی۔ پیر بدیع الدین شاہ وغیرہ نے احسان بھائی کے زخمی ہونے کے بعد افراد جماعت میں اتحاد پیدا کرنے کے لیے جو سلسلہ جنبانی کی اس کا بھی تذکرہ آیا۔

شیخ عبدالعزیز عتیق نے یہ بات بالکل سچ کہی کہ وہ جماعت کی تلوار تھے جو ٹوٹ گئی اور جماعت کی زبان تھے جو کٹ گئی اور جماعت کی ڈھال تھے جو جماعت سے چھن گئی۔

جزع فزع سے کوئی فائدہ نہیں، اردو ادب کے روایتی جملے "بے وقت کی موت" یا "ناقابل تلافی نقصان" وغیرہ اسلام کی صحیح تعلیمات سے میل نہیں کھاتے، ہمارے لیے صبر کے سوا چارہ کار نہیں۔

تحریک اہلحدیث ایک مشن ہے، جو اسلام کو اندرونی اور بیرونی سازشوں سے بچانے کے لیے خیر القرون میں وجود میں آیا تھا اور اس نے ہر دور میں اسلام کی بنیادی اور اصل تعلیمات اس کے جوہری عقائد، اس کی نتھری ہوئی توحید اور خاتم الرسل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ مبارکہ اور سنت صحیحہ کی حفاظت کی ہے۔ اس راہ میں سب نے دریغ قربانیاں دی ہیں، شخصیات آتی جاتی رہیں گی اور یہ مشن ان شاء اللہ قیامت تک زندہ رہے گا

• لن تزال طائفۃ من اُمتی ظاہرین علی الحق : کی تصدیق ہر حال میں ہوتی رہے گی رب رحیم و غفور اپنے فضل و کرم کے ذریعہ اس مشن کے لیے ہمیشہ ایسے مخلص، صابر و حکیم ایثار و قربانی کے جذبات سے معمور خدام پیدا کرتا ہے گا جو اس مشن کی خدمت کی راہ میں ہمارے اسلاف اور احسان بھائی اور یزدانی اور قدوسی صاحبان کی طرح قربانیاں دیتے رہیں گے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ احسان بھائی اور ان کے ساتھ وفات پانے والے ہمارے معتبر علماء مولانا حبیب الرحمٰن صاحب یزدانی، مولانا عبدالخالق قدوسی محمد خان نجیب، شیخ احسان الحق معراج دین اور جناب عبدالسلام اور دیگر متوفین کی غلطیوں سے درگذر فرمائے، انھیں اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور ان کے پسماندگان جن میں ان کی بیوائیں ان کے یتیم بچے، انکے سوگوار والدین اور بھائی بہنیں اور جماعت کے سارے نوجوان اور ہم جیسے لوگ ہیں، کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

یادوں کا یہ مختصر سلسلہ ختم کرتے ہوئے ایک اور بات کی جانب ذمہ داران جماعت کی توجہ مبذول کراؤں گا۔ ممکن ہے اس سے ہمارا احساس جاگ جائے اور ہمارا سویا ہوا شعور بیدار ہو جائے، واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان میں تحریک اہلحدیث نے جب سے منظم ہو کر توحید و سنت کی دعوت کا فریضہ انجام دینا شروع کیا ہے تب سے اب تک یہ صرف انگریزوں کا نہیں صرف غیر مسلموں کا نہیں، صرف قبر پرستوں اور عرس و قوالی والوں کا نہیں ان بھائیوں کا بھی تختۂ مشق بنی رہی ہے جو شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور شاہ اسماعیل بن عبدالغنی دہلوی رحمہم اللہ کو اہل حدیث اور اپنے درمیان قدر مشترک ماننے کا دعوی کرتے ہیں۔ یہ ظلم اگر صرف تاریخی کتابوں میں اہلحدیث حضرات کی خدمات کو ملیامیٹ کرنے کی حد تک ہوتا، تحریک آزادئ ہند سے، تحریک جہاد سے، دارالعلوم ندوۃ العلماء کی تاریخ سے، جمعیت علمائے ہند جمعیت علمائے پاکستان، تحریک خلافت، تحریک احرار، کانگریس اور مسلم لیگ وغیرہ کی تاریخوں سے ان کا نام حرف غلط کی طرح مٹا دینے ہی کی حد تک رہتا تو بھی بات قابل برداشت تھی کہ اللہ حافظ و علام ہے لیکن ہر دور میں بات اس سے کہیں آگے نکل گئی ہے "جامع الشواہد فی اخراج الوہابیین عن المساجد" پر اکابر علماء دیوبند کے دستخط اور مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کے دادا مولانا محمد لدھیانوی کی کتاب "انتظام المساجد باخراج اہل الفتن والمفاسد" اور اس میں اہلحدیث کو "مرتد" قرار دے کر حکام وقت سے ان کے قتل کا مطالبہ اور ساتھ ہی یہ فتویٰ کہ اگر اہل حدیث توبہ کریں تو اس کی توبہ قبول نہ کی جائے۔ اور مولانا مدنی کی "الشہاب الثاقب"، محمد علی مونگیری مولانا

محمد ثانی کی تصنیف، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی نظر ثانی کردہ کتاب سیرت محمد علی مونگیری، اور محمد ایوب صاحب قادری کی بیشتر تصنیفات میں علماء اہلحدیث، جماعت اہلحدیث، افراد اہلحدیث کے خلاف یا تو عوام اور غیر مسلم حکومتوں کو بھڑکایا گیا ہے، ان کے واجب القتل ہونے کا فتویٰ دیا گیا ہے۔ یا شک اور شبہ میں لپیٹ کر ایسی زہریلی بات کہی گئی ہے جو کھلے فتووں سے بھی زیادہ خطرناک ہے اور یہ ماضی کا قصۂ پارینہ نہیں بلکہ ہمارے یہ بھائی اس تسلسل کو اپنے "دل" کے ہاتھوں مجبور ہو کر اب تک باقی رکھے ہوئے ہیں۔ آج بھی بہت سی مسجدیں ہیں جن میں افراد اہل حدیث کو نماز نہیں پڑھنے دیا جاتا۔ ابھی چند سال قبل ڈمراؤں ضلع آرہ میں ایک اہلحدیث فرد کو آٹھ رکعت تراویح کے جھگڑے میں قتل کر دیا گیا۔ بگھا کسہار ضلع مدھوبنی میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی عقیدت میں شریک ہمارے اہل علم اور روشن خیالی کے دعوے دار بھائیوں نے افراد اہل حدیث کو مسجد سے نکال دیا، کنوئیں سے پانی لینے سے روک دیا اور جب انھوں نے اپنا ایک گھر خاص کر کے اس میں نماز پڑھنا شروع کیا تو پولیس کو بلا کر انھیں حالتِ نماز میں گرفتار کرنے پر آمادہ کیا گیا۔ اسی طرح ٹانڈہ بادلی ضلع رامپور میں جہاں گیارہ مدرسے ان بھائیوں کے ہیں جو شاہ ولی اللہ کی عقیدت میں ہمارے شریک ہیں انھیں بھائیوں نے جماعت اہل حدیث کے افراد کے اپنی چھوٹی سی مسجد میں مسنون طریقے کے مطابق جمعہ کے لیے ایک اذان کہنے کے "جرم" پر ریوالور نکال لیے اور مسجد میں آ کر زبردستی دو اذانیں کہہ کر دوسرا جمعہ قائم کیا۔

ایک اور پہلو قابل توجہ ہے کہ شیخ الاسلام علامہ امرتسری رحمہ اللہ کے خاندان کو عالم قادیانیت نے جس طرح پوری دنیا سے نیست و نابود کرنے کی سازش رچی اور اپنے جھوٹے مکار اور کذاب نبی کی موت کا انتقام علامہ امرتسریؒ کے دو صالح پوتوں کو دن دہاڑے ان کے گھر میں قتل کر کے لیا۔ آج بھی اس کا زخم ہرا ہے۔ اور پھر احسان بھائی اور ان کے ساتھیوں کے ساتھ جو حادثہ ہوا کیا یہ واقعات جماعت کی غیرت و حمیت کو جگا سکیں گے۔ انتقام کے لیے نہیں، کیونکہ انتقام لینے والا تو رب العالمین ہے۔ لیکن اس داعیہ سے کہ ہم اپنے کردار پر نظر ثانی کریں۔ اپنی نیتوں کی تصحیح کریں، دوستی اور دشمنی کے حدود کتاب و سنت کی روشنی میں مقرر کریں اور اپنی صفوں میں موجود انتشار و تشتت اور ظلم و جمود کو ختم کرنے کی تدابیر عمل میں لائیں اور حقوق و فرائض کی نزاکتوں کو محسوس کرتے ہوئے اپنے فرائض کی ادائیگی حقوق طلبی سے پہلے کریں تاکہ حق حقدار کو پہونچ سکے اور ہم اللہ تعالیٰ کی

باقی صـ۵۹ پر